بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

تغیر یا انقلاب کی عام طور پر دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو آتش فشاں دھماکوں کے ساتھ آتا ہے۔بڑی تندی اور تیزی کے ساتھ اٹھتا ہے اور پھر پوری قوت اور طاقت کے ساتھ پھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے اندھے دیکھتے، بہرے سنتے اور انجان سے انجان آدمی جانتے ہیں۔اس سے پوری دھرتی ہلتی ہے، خون کی ندیاں بہتی ہیں۔اس کی ہلاکت خیزیوں اور فتنہ سامانیوں کے گھر گھر تذکرے ہوتے ہیں۔اس کی بڑھتی ہوئی یلغار کو دیکھ کر سارے انسانوں کے اندر ایک شدید اضطراب اور ہیجان پیدا ہوتا ہے۔انقلاب کی یہ قسم بلاشبہ بڑی خطرناک ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرر رساں اور مہیب انقلاب کی وہ قسم ہے جو گھن کی طرح اندر ہی اندر قوموں کو کھا جاتی ہے، جو ایک خاموش آندھی کی طرح لوگوں کے دل کی بستیاں زیر و زبر کرتی ہے، افکار و نظریات کے چمنستانوں میں چل کر انہیں ویرانے بنا دیتی ہے، مقدس جذبات اور پاکیزہ احساسات کی لہلہاتی کھیتیوں کو لق و دق صحراؤں میں تبدیل کرتی ہے یا آتش خاموش کی طرح لوگوں کے خرمن ایمان کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے مگر انہیں خبر تک نہیں ہونے پاتی اور وہ آخر وقت تک اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کا کوئی زیاں نہیں ہو رہا بلکہ ان کے دینی سرمایے میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے

مسلمانوں کو گزشتہ دو سو برس میں انقلاب کی انہی دونوں قسموں سے سابقہ پیش آیا ہے پہلی قسم کے انقلاب سے ان کے ممالک تاخت و تاراج ہوئے، ان کے نوجوان موت کے گھاٹ اتارے گئے، ان کی عورتیں ذلیل و رسوا ہوئیں، ان کی آبرو لٹی اور ان کی عفت چھنی۔ان کے امراء اور شرفاء کو ذلت کی اس حد تک پہنچا یا گیا جس کے بعد کوئی دوسری حد نہیں ہوتی۔ان کے اندر الحاد اور بے دینی کو پھیلانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس انقلاب سے بے شک اس قوم کے اندر زبردست تباہی اور بربادی آئی مگر یہ بربادی کوئی

دبے پاؤں نہ آئی جسے کوئی جان نہ سکتا۔ یہ بربادی کپکپا دینے والی اور عقل و خرد کو مبہوت کر دینے والی گرج کے ساتھ آئی جس کے زلزلہ انگیز دھماکوں سے پہاڑوں کی چوٹیاں ہل گئیں۔ اسے سن کر ہر صاحب ایمان ہراساں اور پریشاں ہؤا اور اس نے کسی نہ کسی طرح اس کو روکنے کی کوشش کی۔

لیکن اس انقلاب سے کہیں زیادہ گہرا، کہیں زیادہ خوفناک اور کہیں زیادہ ہلاکت خیز وہ انقلاب تھا جو دبے پاؤں آیا، جسے حساس سے حساس کان بھی مشکل سے سن سکے اور تیز سے تیز نگاہ بھی مشکل سے بھانپ سکی۔ اس انقلاب نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا اور مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کی بجائے مسلمانوں کے دل و دماغ اس طرح بدل دیئے کہ وہ اپنی بستیوں کو خود اجاڑنے لگے۔ بظاہر اس نے لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ نہ ڈالا مگر اندر ہی اندر سے اُسے بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ اس کا اثر ان قلوب پر ہؤا جو اگرچہ سعادت و نجات کی راہ اسلام کو ہی سمجھتے تھے اور اس پر سختی سے کاربند بھی تھے مگر وہ اپنے اسلام کو الحاد کی دستبرد سے پوری طرح بچا نہ سکے۔ اور ان کی مہر حد ایمانیات میں زندقہ اس طرح آہستہ آہستہ گھستا گیا اور اس کا زہر ان کے معتقدات کے رگ و ریشے میں اس خاموشی کے ساتھ سرایت کرتا چلا گیا کہ آج اگر ان کے مذہبی اصولوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جس چیز کو وہ حضرات اسلام کا نام دیتے ہیں اُسے اسلام سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ زمین کو آسمان سے۔ ان لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ان کا مقصد وحید یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کو اپنی عقل کے مطابق یا زیادہ سے زیادہ حکمائے یورپ کے افکار کے مطابق ڈھالا جائے۔ یہ لوگ اپنی اس سعی کو خدمت اسلام سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام اور کفر کی آمیزش سے ایک ایسا معجونِ مرکب تیار کر رہے ہیں جس میں اگرچہ کچھ اجزا اسلام کے بھی ہیں مگر اس کی تاثیر بالکل غیر اسلامی ہے۔ ان صفحات میں ان لوگوں کے سارے معتقدات کا جائزہ تو نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں ہم صرف ان کے چند گوشوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

مسلمان ہونے کے لیے جس کلمے کا زبان سے ادا کرنا اور دل سے اقرار کرنا ضروری ہے۔ وہ ہے:

• لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ اس کلمے کا پہلا جزو ایمان باللہ ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ہستی کو ماننے کے یہ معنی نہیں کہ ہم اسے محض ایک ایسی قوت تسلیم کرلیں جس نے کائنات کے اولین سامانات کی تخلیق کی اور اس غرض کو نہایت کامیابی سے سرانجام دینے کے بعد اب وہ خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے اس ہنگامۂ خیر و شر کو دیکھ رہی ہے۔ اسلام میں خدا جبر و مقابلہ کا کوئی فارمولا نہیں بلکہ ایک حی و قیوم ہستی ہے جس نے نہ صرف اس کائنات کی تخلیق کی ہے بلکہ جس کا ارادہ اور مشیت اس کے ذرے ذرے میں کارفرما ہے۔ وہی اس کی تنہا خالق، مالک، مدبر اور حکمران ہے۔ یہ سارا کارخانۂ قدرت صرف اسی کے اشارۂ ابرو سے چل رہا ہے اس کے علاوہ یہاں کسی کو کوئی قدرت اور اختیار حاصل نہیں۔ وہ جس طرح چاہے کرے کوئی اس کی راہ روک نہیں سکتا۔ قرآن مجید میں اس موضوع پر بے شمار آیات ملتی ہیں۔ ان میں سے چند ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ أُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳: ۶)	اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور ام الکتاب اسی کے ہاتھ میں ہے۔
اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۱: ۹)	بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۵: ۱)	بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔
اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ (الفرقان-۱)	وہ ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ ہی اس کی سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا ہے۔
مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (الکہف-۴)	اس کے سوا بندوں کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے فیصلوں میں شریک کرتا ہے۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالقِ اول ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اسی کا حکم اس کائنات کے گوشے گوشے میں کارفرما ہے۔ اور کسی کی کوئی مجال نہیں کہ اس سے سرِ مو انحراف کر سکے۔

خداوند تعالیٰ کی حاکمیت، عظمت اور قدرت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید ہمیں اس حقیقت سے بھی آشنا کرتا ہے کہ اُس عظیم ذات کا ہماری زندگی کے ساتھ ایک گہرا تعلق اور رابطہ ہے۔ وہ کوئی مجرد اصول نہیں بلکہ ایک ایسی ہستی جو ہر لمحہ اس کائنات کی نگرانی کرتی ہے:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ (انعام - ۷)

اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو اور زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ. (بقرہ - ۲۴۲)

اللہ وہ زندہ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اُونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی الّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اُس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ اور برتر ذات ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ

جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے سب جانتا ہے

فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا	اور جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ - لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	وہ اس کو دیکھتا ہے۔ آسمان اور زمین کی بادشاہی اُسی کی
وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۔ (حدید-۱)	ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

مندرجہ بالا آیات پر پھر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ قرآنِ پاک کس بلیغانہ انداز میں اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب خداوند تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کے پیچھے تنہا اسی کی مشیت کام کر رہی ہے اور اس میں صرف اُسی کا ارادہ کارفرما ہے۔ یہ کائنات اور اس کے ہنگامے علت و معلول کی کرشمہ سازیاں نہیں بلکہ ایک بااختیار ہستی کی منصوبہ بندیاں ہیں۔ وہی ذات ہے جس نے علت کو علت اور معلول کو معلول بنایا ہے۔ اس لیے علت و معلول کی حقیقت بھی انسان کو اس سے زیادہ کیا معلوم کہ بقول امام غزالیؒ ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔ اس کائنات میں اصل قوت اور طاقت صرف خداوند تعالیٰ کی ہے وہ اگر چاہتا ہے تو علت و معلول کی کڑیوں کو جوڑ کر انسانی سعی کو کامیاب بنا دیتا ہے اور اگر اس کا ارادہ نہیں ہوتا تو یہ سب تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور نتائج انسان کی منشا اور توقع کے بالکل برعکس برآمد ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ	اگر اللہ تجھے مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی
لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ	نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں
يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ	کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (یونس-۱۱)	بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے
	اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم
	فرمانے والا ہے۔

پھر اسی حقیقت کو حضرت ہود علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ اِنِّيْ	تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا - اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ - (ہود - ۵)	میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی - کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو - بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے -

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت کو اور انسانی معاملات پر اس کی کڑی نگرانی کو ان الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے :

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ - اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ - (۳)	کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے - بھلائی تیرے اختیار میں ہے - بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے -

---

گذشتہ صفحات میں ہم نے قادرِ مطلق کی جس قدرت کا ذکر کیا ہے اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اس کائنات میں جبریت کے قائل ہیں - انسانی زندگی میں بلا شبہ جبر کا بھی ایک پہلو ضرور ہے مگر انسان کو ایک محدود حد تک اختیار بھی دیا گیا ہے تاکہ وہ اس دائرہ کے اندر رہ کر اپنی آزادی کو استعمال کر سکے - انسان کی یہی آزادی دراصل اس کے شرف کی اساس ہے اور اسی سے اس کے اندر ایک اخلاقی احساس جنم لیتا ہے اگر یہ حس اس میں موجود نہ ہوتی تو ایک انسان اور حیوان میں قطعاً کوئی فرق نہ ہوتا -

ان آیات کو یہاں درج کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن مجید کی رُو سے ذات باری تعالیٰ کوئی اندھا بہرا لزوم اور لگا بندھا ضابطہ نہیں بلکہ وہ ایک ایسی باشعور، علیم وخبیر اور زندہ جاوید ہستی ہے جس کے ساتھ ہمارا نہایت ہی گہرا رابطہ ہے ہم زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک ہر قدم پر اُس کی توجہ کے محتاج ہیں - خداوند تعالیٰ محض تخیل نہیں بلکہ ایک ذات ہے جس کے ساتھ ہمارا ذہنی اور قلبی دونوں طرح کا ہر گونہ تعلق ہونا چاہیے - سورۂ الشعراء میں دیکھیے فکر وجذبہ کے کس حسین امتزاج کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام بندے اور مالک کے اس باہمی

تعلق کو بیان فرماتے ہیں۔ اور پھر اس میں یہ بھی دیکھیے کہ یہ تعلق کتنا قریبی ہے اور اس کے چشمے احساسات کی کن عمیق گہرائیوں سے ابل رہے ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ هُوَ	(رب العالمین) جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی
یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ	فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو
وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ	جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دیگا اور
اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔	پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں امید رکھتا
(الشعراء۔ رکوع ۵)	ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔

خدا اور بندے کے اس باہمی رابطہ کی قرآن مجید مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے وضاحت فرماتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اس کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ	ہم نے انسان کو پیدا کیا اور جو باتیں اُس کے جی میں آتی رہتی ہیں
بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ	ہم اُن کو جانتے ہیں اور ہم اُس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ
(ق۔ ۲)	اس کے قریب ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر وہ اس تعلق کو یوں بیان کرتا ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ	اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں
اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ	تو انہیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا
وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔	جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا
(۲۔ ۲۳)	ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور
	مجھ پر ایمان لائیں۔

پھر سورہ نمل میں ایک نہایت لطیف پیرائے میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ خالق کائنات ایک نہایت ہی حساس ہستی ہے جو نہ صرف ہمارے دلوں کے اسرار کو جانتی ہے بلکہ ہماری ذہنی کیفیات اور قلبی واردات سے بھی پوری طرح واقف ہے اور جب ہم مضطرب اور پریشان ہو کر اُس کی طرف متوجہ

ہوتے ہیں تو وہ ہمارے اس اضطراب کو پوری طرح محسوس کرتی ہے اور اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اسے اطمینان سے بدل دیتی ہے۔ یہاں قرآن مجید استفہامیہ انداز اختیار کرکے اس حقیقت کو یوں ذہن نشین کراتا ہے:

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوءَ — کون ہے جو بے قرار ہو کر پکارنے والے کی دعا سنتا ہے اور اس کی مصیبت ٹال دیتا ہے۔ (النمل۔ ۶۲)

قرآن مجید اور احادیث کے مختلف مجموعوں میں جو دعائیں منقول ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ انسان صرف اسی کے در کا گدا، اسی کے آستاں کا سوالی، اسی کی رحمت اور بخشش کا امیدوار، اور اسی کے فضل کا محتاج ہے۔ اُس کے ساتھ ہمارا رشتہ براہِ راست مضبوط اور پائیدار ہے۔ انسان جب اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر مانگتا ہے تو وہ نہیں سمجھتا کہ وہ کسی بے جان تصور کے سامنے دستِ سوال دراز کر رہا ہے بلکہ وہ اس یقین کے ساتھ خدا کے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید ہستی ہے، اس کی رحمت بے پایاں اور اس کے خزانے بے حد و حساب ہیں۔ وہ ہماری پکار کو سنتا ہے اور جو کچھ ہم اس سے طلب کرتے ہیں وہ اگر اُسے ہمارے حق میں نافع سمجھتا ہے تو اس سے ہمیں نوازتا ہے اور بسا اوقات ہماری طلب سے کہیں بڑھ کر ہمیں دیتا ہے۔ ہمارے اور اُس ذات کے درمیان جو رشتہ موجود ہے اُسے علت و معلول کی کڑیوں نے ترتیب نہیں دیا بلکہ اُس کی نوازشوں اور اس کی رحمتوں سے اس کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ آپ قرآن مجید اور حدیث کی چند دعائیں ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ احساسِ بندگی، اطاعت اور فرمانبرداری کے علاوہ کس قدر دل آسا، خیال انگیز اور درد مندانہ کیفیت کا نام ہے جو جذبات اور درد و شوق کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو اختیار کر لینے کے بعد انسان کے اندر کس طرح اپنی شکستگی و درماندگی، عاجزی و بے چارگی، بیکسی و بے بسی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ کس جذب و شوق کے ساتھ اپنے خالق اور مالک کی طرف رجوع کرتا ہے:

رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ — اے ہمارے رب تو ہمیں وہ عطا کر جس کا اپنے رسولوں کی معرفت تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے

(آل عمران - ۱۱)

دن رسوا نہ کر، تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ ۔ (اعراف - ۹)

اے اللہ تو ہمارا کارساز اور مددگار ہے پس ہمیں مغفرت بخش دے اور ہم پر رحم کر، تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے۔

رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل - ۹)

پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک قوت کو میرا مددگار بنا دے۔

حضور سرورِ کائنات سے جو دعائیں مروی ہیں ان کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے خود بخود یہ نقشہ اُبھر آتا ہے کہ خالق کا ایک عاجز بندہ اپنے قادر و قاہر مولا سے اس امید کے ساتھ مانگ رہا ہے کہ اُس کے دروازے سے آج تک کبھی کوئی ناکام نہیں گیا۔ بندہ قلبی اضطراب کے ساتھ مانگتا ہے تاکہ مالک الملک اُسے مضطرب دیکھ کر اس پر رحم فرمائیں۔ وہ اس کے سامنے سرِ نیاز خم کرکے اس سے طلب کرتا ہے کیونکہ اُس ذات کے علاوہ اس کائنات میں وہ کسی دوسری ہستی کو حاجت روا نہیں مانتا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اُن تمام مناجات کو نقل کیا جاسکے۔ ہم صرف دو دعائیں نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ ایک مومن صادق کو اپنے خالق اور مالک کے ساتھ کس قسم کا تعلق خاطر قائم کرنا چاہیے اور اس ذات کے بارے میں اُس کے احساسات اور جذبات کی کیا نوعیت ہونی چاہیے:

اللھم انک تسمع کلامی وتری مکانی و تعلم سری وعلانیتی لایخفی علیک شیٔ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی اسالک مسئلۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے تو میرے پوشیدہ اور ظاہر دونوں سے واقف ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی میں تو مصیبت زدہ محتاج فریادی ہوں ترساں و ہراساں اور اپنے گناہ کا اقرار کرنے والا ہوں میں ایک بیکس کی طرح تیرے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہوں، اور ایک ذلیل گناہ کار کی طرح

الخائف الضرير ودعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته وذل لك جسمه ورغم لك انفه اللهم لا تجعلني بدعائك شقيا وكن بي رؤوفا رحيما، يا خير المسئولين ويا خير المعطين!

تیرے سامنے گڑگڑاتا ہوں اور ایک خوف زدہ اور آفت رسیدہ کی طرح تجھ سے طلب کرتا ہوں۔ وہ جس کی گردن تیرے حضور میں جھکی ہوئی ہے، جس کے آنسو بہہ رہے ہیں، جو تیرے سامنے فروتنی کیے ہوئے ہے اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑتا ہے۔ بارالہا! مجھے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں رحمت اور شفقت اختیار کر، اے اُن سب سے بہتر جن سے مانگا جائے اور عطا کرنے والوں میں سب سے ارفع و اعلیٰ ذات۔

اللهم اليك اشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس يا ارحم الرّحمين الىٰ من تكلني الى عدو يتجهمني او الى قريب مّلّكته امري۔ ان لم تكن ساخطا عليّ فلا ابالي غير ان عافيتك اَوسَعُ لِي۔

بارالہا! مَیں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنے کمزور ہونے کی، ساز و سامان کی قلت کی اور لوگوں کی نظر میں کم وقعتی کی۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ کسی دشمن کے کہ مجھ سے سینہ زوری کرے اور مجھے ستائے یا کسی عزیز کے کہ جس کے سپرد میرے سب کام کر دیے جائیں۔ اگر تو ناراض نہ ہو تو مجھے کچھ پروا نہیں مگر پھر بھی تیری عافیت میں میرے لیے زیادہ فراخی ہے۔

آپ ان مناجات کو بار بار پڑھیں اور دیکھیں کہ یہ احساسات کس توکل، ورع، خشیت، عجز و انکسار اور رقتِ قلب کے آئینہ دار ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ خداوند تعالیٰ سے مانگنے والا گو اپنے آپ کو اُس کے سامنے بالکل حقیر پاتا ہے مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں اُس مالک اور خالق کی قربت کا کس قدر شدید احساس بھی موجود ہے۔ اسے اُس کی رحمت پر کتنا زبردست بھروسا ہے۔ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہو کر، اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہے۔ کیا اس قسم کے احساسات کسی تصور یا نظریہ یا فارمولا کے متعلق بھی پیدا ہو سکتے ہیں؟

خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے بارے میں ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم قوانینِ فطرت کے اندر کوشش اور جد و جہد کو عبث اور بیکار سمجھتے ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ مسلمان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہماری ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانوں کو زندگی کے سارے میدانوں میں جد و جہد کرنی چاہیے مگر اس سعی و جہد کے بعد ترتیبِ نتائج کے لیے مشیتِ ایزدی کی طرف بھی رجوع کرنا ازبس لازمی ہے۔ ہم یقیناً گمراہ ہونگے اگر اپنی ساری کوشش صرف علت و معلول کی کڑیاں جوڑنے میں صرف کرتے رہیں اور اس علت العلل اور اُس مسبب الاسباب سے کوئی تعلق استوار کرنے کی فکر نہ کریں جو ان کے اندر ربط پیدا کر کے ہماری سعی و جہد کو ٹھکانے لگاتا ہے یا ہماری کوششوں کو اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت ہماری نظر میں ناکام بنا دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ کی ذات اب مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی نظر میں مجرد ایک تصور، ایک لگا بندھا اصول، ایک غیر تبدیل قانون یا علت و معلول کا ایک طلسم ہوشربا بن کر رہ گئی ہے۔ ہم میں سے ایک معقول تعداد ہر روز ایاك نستعين سے اس کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ نہ تو خدا کی مدد پہ ہم بھروسہ رکھتے ہیں اور نہ ہی ہمارا کسی کام میں اس کی طرف سے خیر و برکت پر ایمان ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دنیا صرف عالمِ اسباب ہے اس لیے کامیابی اور کامرانی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ مادی اسباب و ذرائع جمع کریں۔ اگر اس مقصد میں کامیاب ہوں تو اس کامیابی کو اپنی قوتِ بازو اور حسنِ تدبیر کی کرشمہ سازی خیال کریں اور کہیں ناکامی ہو تو علت و معلول کی کڑیوں کا معائنہ شروع کر دیں اور اگر وہ ڈور بھی کچھ ایسی الجھی ہوئی ہو کہ سرا نہ ملے تو اس ناشدنی واقعہ کو اتفاق سے تعبیر کر کے خاموش ہو جائیں مگر کبھی اُس ذات کی طرف رجوع نہ کریں جو اس کائنات کی مالک ہے۔ بہترین اسباب و وسائل، بہترین قوتیں اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بہترین ذرائع فراہم کرنا بلاشبہ زندگی میں نہایت ضروری چیزیں ہیں مگر ان سے کہیں زیادہ ضروری خداوند تعالیٰ کے حضور میں سر نیاز خم کرنا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنا بھی ہے۔

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ ۔۔۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں یقیناً اللہ اپنے

بِالْعِبَادِ (۴۰ : ۵) بندوں کا نگراں ہے۔

اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے ایمان باللہ کے دعوے کے باوجود خدا کے ساتھ عبودیت کا وہ رشتہ استوار نہیں کیا جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر وقت اسباب کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں یا علت و معلول کی محسوس کڑیوں کو جوڑنے میں اپنی ساری قوتیں کھپا دیتے ہیں مگر ہمیں کبھی اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اس عالمِ اسباب کے پیچھے ایک اخلاقی نظام بھی کارفرما ہے۔ اور یہاں خدا کی مشیت اور ارادے کو بھی پورا پورا دخل ہے۔

آپ ذرا ان سارے پروگراموں، اسکیموں اور منصوبہ بندیوں کا جائزہ لیں جو ملک و ملت کی ترقی اور فلاح بہبود کے لیے تیار کی جا رہی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ذرائع و وسائل کو جمع کرنے کی تو ساری مدیں موجود ہیں لیکن اگر کوئی مد خارج از بحث ہے تو وہ صرف "رجوع الی اللہ" ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت اُس پانچ سالہ منصوبے کی کاپیاں پڑی ہوئی ہیں جو ہم نے اپنی قوم کا معاشی معیار بلند کرنے کے لیے تیار کیا ہے۔ اس منصوبہ میں اغراض و مقاصد سے لیکر زراعت، صنعت و تجارت اور بنکاری، قدرتی ذرائع اور آبادی الغرض ہر اُس چیز پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس سے کسی قوم کے وسائلِ رزق میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اگر کسی پہلو کو ناقابلِ التفات سمجھا گیا ہے تو وہ اخلاقی اور روحانی پہلو ہے۔ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر ہمارے ہاں رزق کی تنگی ہے تو اس کے کچھ مادی وجوہ ہیں یعنی ہمارے ہاں لوہے اور کوئلے کی کمی ہے، ہمیں غیر ملکی زرِ مبادلہ دوسری اقوام کی نسبت کم فراہم ہوتا ہے، ہمارے ملک کی آب و ہوا ایسی ہے کہ لوگ اچھی طرح محنت و مشقت نہیں کر سکتے، ہماری پٹ سن کی قیمت دنیا کی منڈیوں میں گر رہی ہے۔ ہمارے پہاڑوں پر درخت موجود نہیں اور اس بنا پر ہر سال سیلاب آجاتے ہیں۔ ہماری آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے لہٰذا ہمیں اپنی قوم کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے ان سارے امور کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ پھر اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے جو منصوبے تیار ہوتے ہیں اُن میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے آبادی کو برتھ کنٹرول کے ذریعے روکا جائے، کوئلے کی کمی

کو بجلی کے ذریعہ پورا کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑوں پر زیادہ سے زیادہ درخت اگانے چاہییں اور اس ملک میں جلد از جلد صنعتوں کا ایک وسیع جال پھیلانا چاہیے تاکہ غیر ملکی زرمبادلہ بچایا جاسکے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ مؤثر ہو سکتی ہیں لیکن ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ خداوند تعالیٰ جس نے اسباب کی یہ دنیا پیدا کی ہے اور جس نے ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں بخشی ہیں، اسی نے تنگیٔ رزق کے کچھ اخلاقی اور روحانی وجوہ بھی بیان کیے ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں انہیں بھی اپنی نگاہ میں رکھنا چاہیے اور انہیں اپنے منصوبوں اور اسکیموں میں اتنی ہی اہمیت دینی چاہیے جس کے وہ حامل ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید نے رزق کی تنگی کا ایک بہت بڑا سبب خداوند تعالیٰ سے غفلت اور بے تعلقی کو قرار دیا ہے:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (طٰہٰ: ۷)	اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی اس کے لیے معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

قرآن پاک میں جا بجا معاشی خوش حالی و فارغ البالی کا ایمان و تقویٰ کی زندگی ہی پر وعدہ فرمایا گیا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے:

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (رکوع ۱۲)	اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انہوں نے جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُن بُری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

ایک جگہ اہل کتاب کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد ہے کہ:

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (المائدہ ۔ ۹)	اگر یہ لوگ توریت، انجیل اور جو کچھ خدا کی طرف سے آیا اس کی پوری پابندی کرتے تو اوپر اور نیچے دہر طرف سے خوب کھانے پینے کا سامان پاتے۔

سورۃ ہود کے شروع میں حضور سرور دو عالم کی زبان سے ارشاد ہے کہ:

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (رکوع ۱)

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دیگا۔

پھر اسی حقیقت کو حضرت ہود علیہ السلام کی زبان سے یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (ہود - ۵)

اے میری قوم والو اپنے پروردگار سے (اپنی گزشتہ نافرمانی) کی معافی مانگ کر پھر اس کی طرف پلٹ آؤ (از سرنو اس کی فرمانبرداری کا تہیہ کر لو) تو وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دیگا اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کریگا مجرم ہو کر اس کی طرف منہ نہ پھیرو۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (نوح - ۱)

اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی چاہو۔ وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے (وہ معاف کر دینے کے بعد) تم پر خوب بارانِ رحمت بھیجے اور تمہارے اموال و اولاد میں ترقی دیگا اور تمہارے لیے باغ لگا دیگا اور نہریں جاری کر دیگا۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس عالم اسباب میں بھی قوموں کی قسمتوں کے فیصلے دنیاوی مال و متاع پر نہیں بلکہ اخلاقی بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کا مالک اور حاکم ہے اس نے اس دنیا میں مادی وسائل کا انتظام تو کیا ہے اور ان میں علت و معلول کے محسوس رشتے بھی قائم فرمائے ہیں مگر جن قوانین کے ذریعہ وہ اس کائنات کا انتظام چلا رہا ہے وہ مادہ کے بے حس اور میکانکی ضابطے نہیں بلکہ اخلاقی اصول ہیں۔ اگر کسی قوم پر رزق تنگ کر دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ لازمی طور پر وسائل کی کمی یا سرمایہ کی قلت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قدرتی ذرائع و وسائل کی فراوانی کے باوجود اس پر ذلت و مسکنت چھا جاتی ہے اور غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

بلند و بالا ذات مادی اسباب و نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر کچھ دوسرے اصولوں کے تحت اس دنیا کا نظم چلا رہی ہے۔ مثلاً ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں قحط پڑ جائے تو اس کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے باشندوں نے فصل کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کی یا آبپاشی کا معقول انتظام نہیں کیا جاسکا۔ اس لیے جب بھی اس کی روک تھام کی ہمیں فکر لاحق ہوتی ہے تو ہماری توجہ ہر پھر کر مادی اسباب کی طرف ہی پلٹتی ہے۔ ہم چونکہ اسے معاشی کوتاہیوں کا ہی نتیجہ سمجھتے ہیں اس بنا پر اس کے تدارک کے لیے بھی لازمی طور پر معاشی تدابیر پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ ہمیں کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ خشک سالی کے کچھ اخلاقی وجوہ بھی ہو سکتے ہیں اس لیے ہم ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے اور ہمیشہ مادی ذرائع و وسائل کو جمع کرنے اور انہیں نئے نئے طریقوں سے استعمال کرنے میں اپنی صلاحیتیں کھپاتے ہیں۔ ہم زبان سے خواہ خدا کو مانتے رہیں لیکن فکر و عمل سے بہر حال یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ کائنات صرف مادی اسباب و وسائل کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا اوّل تو کوئی خالق نہیں اور کبھی تھا بھی تو عرصہ ہوا مستعفی ہو چکا ہے (العیاذ باللہ) اور اب اس کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل انتہائی افسوسناک ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانوں کو بسا اوقات اخلاقی عیوب اور برائیوں کی پاداش میں مختلف مصائب و شدائد میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضور سرورِ دو عالم نے فرمایا:

ما من قوم یظھر فیھم الزنا الا اخذوا بالسنة وما من قوم یظھر فیھم الرشا الا اخذوا بالرعب۔ رواہ احمد۔ (مشکوٰۃ کتاب الحدود)

کسی قوم میں جب زنا پھیل جاتا ہے تو اسے قحط سالی کی مصیبت میں مبتلا کیا جاتا ہے اور رشوت کی گرم بازاری ہوتی ہے تو اس پر خوف طاری کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ہم صبح و شام دن میں کئی مرتبہ اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہہ کر پکارتے ہیں مگر ہمیں یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی ہمارا پالنہار ہے۔ اگر ہمارا فی الحقیقت اس کی ربوبیت پر ایمان ہوتا تو ہم مادی وسائل و اسباب جمع کرنے سے کہیں زیادہ اس کو راضی کرنے کی فکر کرتے کیونکہ رزق کی ساری کنجیاں تو اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کا رزق چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے غربت اور افلاس میں مبتلا کرتا ہے۔

(بقیہ اشارات)

جو شخص برتھ کنٹرول کے ذریعہ ملک کی آبادی کو روکنے کی تجویز پیش کرتا ہے کیا اس کے بارے میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی خدا کو اپنا رازق سمجھتا ہے اور رزق کے متعلق اللہ کے اُن سارے وعدوں پر جو اُس نے قرآن مجید میں کیے ہیں ایمان رکھتا ہے۔ ہم تو رزق کی کمی کو ضبطِ تولید سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اُس زندہ و پائندہ ذات نے جس کے اختیار میں کائنات کا ہر ذرہ ہے ہمیں یہ یقین دلایا ہے:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۔ (ہود-۱)

زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔

رزق کی وسعت صرف محنت اور سرمایہ کے کامیاب تعامل کا ہی ثمرہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں خدا کا ارادہ اور مشیت بھی کام کرتی ہے۔ بندہ جب اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اسے ایسے ایسے راستوں اور طریقوں سے رزق بہم پہنچاتا ہے جس کا اُسے وہم و گمان نہیں ہوتا:

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (الطلاق-۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اُس کے لیے اُس کی گزران اور روزی کا اس طریق سے انتظام کیا جاتا ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اُس کے لیے کافی ہے۔

بیجا نہ ہو گا اگر بات ختم کرنے سے پیشتر ہم ایک امر کی وضاحت کر دیں۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کی بیشتر قوموں میں یہ اخلاقی برائیاں تو بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن ان کے باوجود وہ خوشحال اور فارغ البال ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رہے کہ اسلام کی نظر میں دنیا کی ظاہری کامیابی و خوشحالی یا مال و متاع کی فراوانی نہ خدا کی خوشنودی کا پروانہ ہے اور نہ کفر و عصیان کی سند۔ خدا کی خوشنودی اور غضب کی بھی کئی ایک صورتیں ہیں۔ وہ کبھی تو رزق کی تنگی کے ذریعہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اسے ہی روحانی اور اخلاقی

ترقی کا زینہ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی فرد یا قوم کا طغیان و عصیان اور سرکشی و نافرمانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی رسی ڈھیلی کر دی جاتی ہے اور اُسے کہا جاتا ہے کہ "جاؤ جو جی میں آئے کرکے دیکھ لو" پھر اسے ذلت کے عمیق گڑھے تک پہنچانے کے لیے ہر وہ چیز اُسے مہیا کی جاتی ہے جس سے اس کی سرکشی میں اضافہ ہو۔ جاہ و ثروت، مال و حیثیت، حکومت و سیاست، علوم و فنون سب اس کے قدموں میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ برائی کرنے کے لیے اپنے دل کے سارے ارمان نکال لے۔ حضور سرورِ کائنات نے اس صورتِ حال کی توضیح میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص گناہوں اور سرکشیوں میں بے باکی سے مبتلا ہے اور پھر بھی اللہ دنیا کی مرغوب و محبوب چیزیں جاہ و مال وغیرہ اس کو عطا فرما رہا ہے تو سمجھ لو یہ استدراج ہے اس کے بعد حضور نے سورہ انعام کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں خود اللہ تعالیٰ نے اس استدراج و تمہیل (یا ڈھیل) کے قانون کو بیان فرمایا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (رکوع ۵)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اسی طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے۔

مندرجہ بالا آیت اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ دولت کی فراوانی ہر حالت میں مُوجبِ خیر و برکت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ اسے آزمائش کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس وقت دولت کی کثرت اور قلت نے نوعِ انسانی کے لیے جو عجیب و غریب الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر رکھی ہیں انھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری نوعِ بشری کا اصل مسئلہ ذرائع و وسائل کی کمی یا زیادتی نہیں

بلکہ اخلاق کا فقدان ہے ــ وہ اخلاق جس کا خمیر خشیتِ الٰہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ انسان جب تک اپنے مالک کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار نہیں کرتا وہ اپنے کسی مسئلہ کو کامیابی سے حل نہیں کر سکتا۔ خدا سے منہ موڑ کر وہ جتنے قدم بھی آگے بڑھاتا ہے اسی قدر اپنی پیچیدگیوں اور پریشانیوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک ناسور پر مرہم رکھتا ہے تو دس نئے ناسور رسنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان اپنی اس بے بسی پر حیران بھی ہے مگر وہ ابھی تک جان نہیں سکا کہ فساد کی اصل جڑ کہاں ہے۔ فطرت نوع بشری کی اس بے کسی کو دیکھ کر محو حیرت ہے اور یہ سوچ رہی ہے کہ آخر انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر بھی وہ اپنے خالق اور مالک کو پہچان نہیں سکتا۔ بالخصوص مسلمانوں کی یہ مادہ پرستانہ روش تو اس پر سخت شاق گزرتی ہے اور وہ اس حاملِ قرآن امت سے حیرت زدہ ہو کر سوال کرتی ہے:

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

"کیا اہلِ ایمان کے لیے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر اور اس کے حکمِ حق کے لیے ان کے اندر درد اور شکستگی پیدا ہو اور وہ اپنے پروردگار کے آگے جھک جائیں۔"